© rasailojaraid.com

رئیس احمد جعفری

(۲)

بیعت

(مسلسل) ______________

خلیفہ کے انتخاب کے سلسلے میں جمہور کی دوسری شرط، ارباب حل و عقد کی بیعت ہے۔ یعنی اگر ارباب حل و عقد، فوج و سپاہ، اور جمہور مسلمین خلیفہ سے یہ عہد کریں کہ اس وقت تک کے احکام بجا لاتے اور اس کے فرمان کی تعمیل کرتے رہیں گے جب تک ایسا کرنا داخل معصیت نہ ہو، اور خلیفہ ان سے یہ عہد کرے کہ وہ حدود و فرائض قائم کرے گا، راہ عدل پر گامزن رہے گا۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا راہ نما بنائے گا، تو پھر یہ بیعت صحیح اور درست ہو گی۔

اسی اصول اور منہاج پر صحابۂ کرام نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر شجرۂ رضوان کے تلے بیعت کی تھی۔ جیسا کہ اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے:

ان الذین یبایعونک انما یبایعون اللہ، ید اللہ فوق ایدیھم فمن نکث فانما ینکث علی نفسہ، ومن اوفی بما عاھد علیہ اللہ فسیؤتیہ اجراً عظیماً!"

یعنی — جو لوگ آپؐ سے بیعت کر رہے ہیں تو وہ (واقع میں) اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے۔ پھر (بعد بیعت کے) جو شخص عہد توڑے گا سو اس کے عہد توڑنے کا وبال اس پر پڑے گا۔ اور جو شخص اس بات کو پورا کرے گا جس پر (بیعت میں) خدا سے عہد کیا ہے، سو عنقریب خدا اس کو بڑا اجر دے گا!"

اسی طرح آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ سے بیعت لی تھی جب آپؐ نے وہاں ہجرت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کرنے کا ارادہ فرمایا تھا۔

اور اسی طرح فتح مکہ کے وقت اہل مکہ سے بیعت لی تھی، اور وہاں کے لوگوں نے آپؐ کی سمع و طاعت کا عہد کیا تھا۔

اسی طرح عورتوں کا معاملہ بھی ہے۔

اللہ تبارک و تعالیٰ ارشاد فرماتا ہے:

یاایہا النبی اذا جاءک المؤمنات یبایعنک علیٰ ان لا یشرکن باللہ شیئا ولا یسرقن ولا یزنین ولا یقتلن اولادھن ولا یاتین ببھتان یفترینہ بین ایدیھن وارجلھن ولا یعصینک فی معروف فبایعھن و استغفر لھن اللہ ان اللہ غفور الرحیم!"

یعنی:۔ اے نبیؐ جب مسلمان عورتیں (اس غرض سے) آپؐ کے پاس آئیں کہ آپؐ سے ان باتوں پر بیعت کریں کہ اللہ کے ساتھ کسی شئے کو شریک نہیں کریں گی، اور نہ اپنے بچوں کو قتل کریں گی، اور نہ بہتان کی اولاد لائیں گی جسے اپنے ہاتھوں اور پاؤں کے درمیان (صلب شوہر سے جنی ہوئی دعویٰ کر کے) اور معروف باتوں میں آپؐ کے خلاف نہ کریں گی تو آپؐ ان کی بیعت کر لیا کیجیے۔ اور ان کے لیے اللہ سے مغفرت طلب کیا کیجیے بے شک اللہ غفور رحیم ہے۔"

صحابۂ کرام نے حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ہاتھ پر بیعت اس وقت کی جب انھوں نے انصار پر مہاجرین کی فضیلت بیان کر دی۔ اس کے بعد ہی حضرت عمرؓ نے فرمایا:

"ہاتھ بڑھایئے، میں بیعت کرتا ہوں۔"

بعد ازاں مسلمان بیعت پر ٹوٹ پڑے۔

پھر حضرت ابوبکرؓ نے جب حضرت عمرؓ بن خطاب کو منصب خلافت کے لیے موزوں پایا تو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ان کے لیے بیعت لی، اور مسلمانوں نے بھی بیعت کرلی۔

اسی طرح حضرت عمرؓ نے چھ آدمیوں کو خلافت کے لیے موزوں پایا تو جب حضرت عثمانؓ پر اتفاق ہوگیا تو مسجد نبوی میں اہل مدینہ نے ان سے بیعت کی۔

اسی طرح اہل مدینہ نے حضرت علیؓ کے دست مبارک پر سمع و طاعت کی بیعت کی۔

بیعت کا اصول عصر اموی تک اور بنو عباس کے خلفاء اولین تک جاری رہا۔

عصر صحابہ میں بیعت تمام تر آزادی رائے پر مبنی ہوتی تھی۔ اور التزام طاعت میں کوئی جبر و جور نہ تھا۔

لیکن عہد اموی میں یہ صورت قائم نہیں رہی۔ بلکہ جبر و جور کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ حکم کی بجا آوری لازم قرار پائی۔ طاعت پر جبر کیا جانے لگا۔ بلکہ حجاج بن یوسف، اور اس جیسے دوسرے ظلم پیشہ لوگوں نے تو الفاظ بیعت کے سلسلے میں طرح طرح کی اختراعات و ایجادات سے کام لیا۔ چنانچہ یہ لوگ جب بیعت لیتے تھے تو بیعت کرنے والے کو مجبور کرتے تھے کہ کہے:

"اگر میں خلیفہ کے حلقۂ طاعت سے باہر نکلوں تو میری بیویوں پر طلاق، اور میرے تمام غلام آزاد ہیں"

یہ الفاظ بیعت کرنے والے کے منہ میں اس لیے ڈالے جاتے تھے کہ لوگ مطلق طور پر آنکھ بند کر کے خلیفہ کی طاعت کریں۔

بنو عباس کے خلفاء اولین بھی لوگوں کو بیعت پر مجبور کرتے تھے۔ لیکن حجاج اور اس جیسے دوسرے لوگوں کی طرح مذکورۂ بالا الفاظ استعمال کرنے پر مجبور نہیں کرتے تھے۔

ابو جعفر منصور خلیفۂ عباسی کے بارہ میں کہا جاتا ہے کہ اس نے لوگوں کو اپنی بیعت پر مجبور کیا تھا۔ اس لیے اس کے والی مدینہ نے امام مالکؒ کو اس بات سے منع کردیا تھا کہ وہ یہ فتویٰ نہ دیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کریں کہ مجبور کر کے قسم لینے سے قسم نہیں ہوتی، نہ مجبوری کی حالت میں دی ہوئی طلاق کی کوئی حقیقت ہے امام مالک کو یہ حکم اس لیے دیا گیا تھا کہ ان کا فتویٰ اگر جاری رہا تو جو لوگ بیعت پر مجبور کیے گئے تھے وہ حلقۂ طاعت سے آزاد ہو جائیں گے۔ کیونکہ اگر جبریہ قسم نامعتبر ہے، اور جبریہ طلاق کا اعتبار نہیں تو جبریہ بیعت کب جائز ہو سکتی ہے؟

بیعت کا یہ اصول، عقد اجتماعی کے اس نظریے سے پورے طور پر ہم آہنگ ہے جو عہد جدید کے ماہرین سیاست کا وضع کیا ہوا ہے۔ بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔

ژان ژاک روسو، اور دوسرے مغربی مفکرین سیاست نے قیام حکومت کی اصل یہ قرار دی ہے کہ وہ حاکم اور محکوم کے مابین ایک معاہدہ ہے۔ حاکم اس امر کا پابند ہے کہ وہ رعیت کے امور و مصالح کی نگہداشت کرے گا، اور رعیت طاعت اور ٹیکس کی ادائی کی پابند ہو گی۔ اگرچہ اس معاہدے کے سلسلے میں حاکم اور محکوم کے مابین شدید اختلاف ہی کیوں نہ پیدا ہو جائے۔

اس کے برعکس فطرت مستقیمہ کی روشنی میں مسلم علماء نے جو اصول وضع کیا ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ارفع و اولیٰ ہے۔ اسلامی حکومت میں کچھ بندھے اصول ہیں جن کی تعمیل اور بجا آوری کے بعد یہ عقد اجتماعی مکمل ہوتا ہے۔ علماء اسلام نے اصول نظم مملکت کو نظری نہیں رکھا ہے بلکہ اسے عملی بنا دیا ہے۔ انھوں نے یوں ہی کوئی بات فرض نہیں کر لی ہے۔ بلکہ اگر نگاہ غور سے دیکھا جائے تو اسلامی نظم مملکت میں حاکم کی ذمے داریاں محکوم سے زیادہ ہیں۔ اور وہ کہیں زیادہ سخت و شدید ہیں جیسا کہ بعض انگریز مفکرین نے اپنی کتابوں میں لکھا ہے کہ وجود حاکم بجائے خود ایک مصلحت ہے علماء اسلام اس اصول کے قائل نہیں ہیں، بلکہ کہتے ہیں کہ اگر حاکم عدل، مصلحت ملی، اور رفق و رواداری کی صفات سے عاری ہے، اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کا حق ادا نہیں کرتا۔ اقامت فرائض میں کوتاہی کرتا ہے، اور تنفیذ حدود سے گریز کرتا ہے اور منع فساد کی قدرت نہیں رکھتا تو وہ حاکمیت کا سزاوار نہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

رئیس احمد جعفری

(۳)

شوریٰ

(بسلسلۂ گزشتہ)

اختیار خلیفہ کی تیسری شرط یہ ہے کہ انتخاب مسلمانوں کے شوریٰ پر مبنی ہو۔ اس کی اصل یہ ہے کہ اسلام نے اختیار خلیفہ کو شوریٰ پر منحصر رکھا ہے جیسا کہ اللہ تبارک وتعالیٰ فرماتا ہے :

وامرھم شوریٰ بینھم

یعنی مسلمانوں کے معاملات مشورے سے انجام پاتے ہیں۔

صرف یہی نہیں اللہ تعالیٰ نے آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی شوریٰ کا حکم دیا ہے :

وشاورھم فی الامر

یعنی (اے نبیؐ) دوسروں سے معاملات میں مشورہ کر لیا کیجیے۔

چنانچہ ہم دیکھتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان تمام امور میں جو منصوص نہیں تھے مشورہ فرمایا کرتے تھے۔ جنگ، معاملات حکومت، اور دوسرے مسائل میں آپؐ مشورہ کے بعد کوئی قدم اٹھاتے تھے بشرطیکہ اس سلسلے میں وحی نازل نہ ہو گئی ہو۔

اسی طرح آپؐ کے بعد صحابہ بھی اسی اصول پر عامل رہے۔ چنانچہ خلفاء راشدین کے دورِ حکومت میں اس اصول سے کبھی انحراف نہیں کیا گیا۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جب نظم مملکت اور کاروبار حکومت چلانے کے لیے شوریٰ ضروری اور لابدی ہے تو خلیفہ کا انتخاب بھی لازمی طور پر شورائی ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اصول اور منطق کا تقاضہ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہی ہے کیونکہ یہ تو کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ نظامِ مملکت تو شورائی ہو اور خلیفہ موروثی۔ کیونکہ وراثت اور شوریٰ ایک دوسرے کی ضد اور نقیض ہیں۔ یہ باب واحد میں جمع ہی نہیں ہو سکتیں۔

بعد میں امیر معاویہ نے جب حکومت اور خلافت کو موروثی بنایا تو بھی ظاہری طور پر اسے بیعت کا پابند رکھا۔ لیکن اس صورت میں بیعت نے اپنے معنی کھو دیے تھے کیونکہ عنصر اختیار اس سے خارج ہو گیا تھا، اور یہی اس کا جوہر، روح اور عطر ہے۔

چنانچہ حضرت حسن بصری نے امیر معاویہ کے بارے میں ارشاد فرمایا:

"معاویہ کی چار خصلتیں ایسی تھیں کہ اگر ان میں سے ایک بھی ہوتی تو وہ تباہ کر دینے کے لیے کافی تھی۔

۱۔ خروج اور شوریٰ سے گریز

۲۔ یزید کو خلیفہ بنانے کی کوشش حالانکہ شرابی تھا، ریشم کا لباس پہنتا تھا، اور طنبورہ سے شغل رکھتا تھا۔

۳۔ زیاد کو اپنا بھائی تسلیم کر لینا حالانکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

الولد للفراش وللعاھر الحجر

یعنی بچہ اسی کا ہے جس کے فرش پر پیدا ہو، اور زانی کے لیے پتھر (سنگساری) ہے۔

۴۔ حضرت حجر بن عدی جیسے جلیل القدر صحابی کا قتل، ہائے حجر اور اصحاب حجر!"

حضرت عمرؓ بن الخطاب اس کے قائل تھے کہ بیعت کے لیے مشورہ واجب ہے، فرمایا:

"مشورہ مسلمین کے بغیر اگر کسی نے کسی شخص کی بیعت کر لی تو یہ بیعت نہیں، نہ بیعت کرنے والے کی، نہ اس کی جس کے لیے بیعت کی گئی۔"

اسی طرح ہم دیکھتے ہیں حضرت عمرؓ ایسے حق امامت سے محروم خیال کرتے تھے جو اُمت

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پر مسلط ہونے کی کوشش کرے یا ایسے شخص کی بیعت کر لے جو اُمّت کے مشورے کے بغیر اور اس کی مرضی اور ارادے کے بغیر، بلکہ اس کی خلاف مرضی امام (خلیفہ) بن جانا چاہے۔

پس ثابت ہوا کہ خلافت کے لیے مسلمانوں سے شوریٰ شرط لازم ہے جس سے کسی صورت میں بھی مفر نہیں۔

البتہ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ مبایعت اور شوریٰ کا طریقہ کیا ہے؟

اور وہ کون لوگ ہیں جنھیں اہل شوریٰ اور اہل مبایعت کہا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے "شوریٰ" کا حکم دیا ہے اور سنّت سے اس کا التزام ثابت ہے۔ لیکن قرآن یا سنّت سے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ شوریٰ کا طریقہ کیا ہے؟ اور اہل شوریٰ کون لوگ ہیں؟

حقیقت یہ ہے کہ طریقہ وضع کرنے کا کام امت کی صواب دید پر چھوڑ دیا گیا ہے۔

اور ایسا ہونا بھی چاہیے تھا۔

ہونا اس لیے چاہیے تھا کہ شوریٰ کا اصول ہر جگہ یکساں نہیں ہو سکتا۔ ہر قوم کے، ہر زمانے کے، ہر ملک کے مخصوص حالات اور روایات ہوتے ہیں۔ ایک زمانے میں جو اصول کار بالکل موزوں اور درست ہوتا ہے دوسرے زمانے میں وہ غیر موزوں، اور نامناسب ہو جاتا ہے۔ ایک قوم اپنی افتاد طبع، اور مزاج کے اعتبار سے کسی اصول کو پسند کرتی ہے، دوسری اس اصول سے گریزاں ہوتی ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کسی قوم کے لیے ایک اصول موزوں اور مناسب ہوتا ہے اور دوسری کے لیے غیر موزوں اور غیر مناسب۔ پس اللہ تعالیٰ نے اصل الاصول کی حیثیت سے شوریٰ کا حکم دے دیا، بالکل ویسے ہی جیسے عدل کا حکم دے دیا، اور یہ کام لوگوں پر چھوڑ دیا کہ وہ اپنے حسبِ حال اور حسبِ مزاج ان دونوں الفاظ کی روح کو قائم اور باقی رکھتے ہوئے طریقہ کار وضع کر لیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اختیار خلیفہ کے سلسلے میں مسلمانوں کے اندر تین طریقے پائے جاتے ہیں جنھیں اس جگہ نسبتہً تفصیل سے ہم ذکر کر دینا چاہتے ہیں۔

پہلا طریقہ :

آزاد رائے (شوریٰ) سے پہلے سے کوئی پابندی قبول کیے بغیر یا وعدہ کیے بغیر کسی کا انتخاب۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا انتخاب اسی طرح عمل میں آیا تھا۔ قوم نے انھیں بغیر کسی عہد کے اپنا امام بنا لیا۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ان کے لیے کسی سے عہد نہیں لیا تھا۔ روایت ہے کہ آں حضرتؐ نے اپنے مرض الموت میں انھیں نماز کی امامت پر مامور فرمایا تھا۔ اس سے بعض صحابہ نے یہ مطلب نکالا تھا کہ خلافت کے لیے بھی آپؐ ابوبکرؓ ہی کو پسند فرماتے تھے اس لیے کہ جس شخص کو دین کی امامت سونپی جا سکتی ہے وہ امور دنیا کا سربراہ بدرجۂ اولیٰ بن سکتا ہے۔

یہ استنباط اگر صحیح ہو تو بھی اس سے حضرت ابوبکرؓ کی ولی عہدی ثابت نہیں ہوتی۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ ثابت ہوتا ہے وہ حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے مابین ان کا مقام بلند۔ اس سے یہ مراد لینا ہرگز صحیح نہیں ہوگا کہ اس طرح حضرت ابوبکرؓ کی ولی عہدی طے ہو گئی تھی، کیونکہ نہ اس کی کوئی تصریح ہے، نہ اس کی طرف دعوت دی گئی تھی۔

اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مذکورہ حدیث جو حضرت ابوبکرؓ کی امامت نماز کی نشان دہی کرتی ہے سقیفۂ بنی ساعدہ کے موقع پر دلیل کی حیثیت سے نہیں پیش کی گئی حالانکہ یہیں اور اسی موقع پر پہلے خلیفۂ رسولؐ کا انتخاب عمل میں آیا تھا۔

بہر حال اس حدیث سے کوئی بھی مفہوم لیا جائے حضرت ابوبکرؓ کی بیعت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی ارشاد کی تعمیل نہ تھی بلکہ یہ آزادانہ انتخاب تھا۔

دوسرا طریقہ :

یہ ہے کہ کسی ایسے شخص کو جو اس کا قرابت دار نہ ہو خلیفہ اپنے بعد اس منصب کے لیے موزوں قرار دے، اور اس کی ولایت عہد کے لیے ساعی ہو۔ جیسے حضرت ابوبکرؓ نے حضرت عمرؓ کے لیے کیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لیکن یاد رکھنا یہ حضرت ابوبکرؓ کی طرف سے امت کے سامنے صرف ایک تجویز تھی، کوئی فرمان نہیں تھا جس کی تعمیل لازمی ہوتی۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ عہد اتحاد الٰہی تازہ تھا جو بلاد عربیہ میں سرعت کے ساتھ پھیلا تھا۔ جیوشِ اسلامیہ جہاد کے لیے دوسرے شہروں میں گئے ہوئے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کو اندیشہ پیدا ہوا کہ جس طرح ثقیفۂ بنو ساعدہ میں اختیارِ خلیفہ کے سلسلے میں اختلاف پیدا ہوا، اگر پھر امت میں اس طرح کا اختلاف رونما ہوا تو حالات اور زیادہ سنگین اور خطرناک صورت اختیار کر لیں گے۔ لہٰذا تمام حالات کا جائزہ لے کر انھوں نے تجویز پیش کی۔ حضرت عمرؓ کو ان کے بعد خلیفہ بنا لیا جائے۔ جن سے نہ ان کی کوئی قرابت تھی نہ رشتہ، صرف اخلاص دینی تھا جس نے انھیں یہ تجویز امت کے سامنے پیش کرنے پر مجبور کیا تھا۔

مسلمانوں نے یہ حقیقت سمجھ لی، اور اس تجویز کو راضی خوشی منظور کر کے اس پر اپنی مہرِ تصدیق ثبت کر دی۔ لیکن اس سے پہلے کہ مہر تصدیق ثبت کریں۔ ابوبکرؓ سے اس کے بارے میں ردوکد بھی کی، اظہار اختلاف بھی کیا، جھگڑے بھی، لیکن جب یہ حقیقت ان پر منکشف ہو گئی کہ موجودہ حالات میں اس سے مناسب کوئی تجویز نہیں ہو سکتی تو بغیر کسی جبر اور دباؤ کے برضا و رغبت اپنے جانشین خلیفہ کی تجویز تسلیم کر لی۔

تیسرا طریقہ:

یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ رسول اللہ ؐ نے کسی کے لیے خلافت کی وصیت نہیں کی تھی اور یہ بھی دیکھا کہ حضرت ابوبکرؓ نے ولایت عہد کی تجویز پیش کی تھی۔ انھوں نے سوچا، اگر میں کسی کا نام نہ پیش کروں تو یہ بھی مناسب ہے، اس لیے کہ اس ہستی نے جو مجھ سے برتر اور بہتر تھی، اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت کسی کے لیے وصیت نہیں کی۔ اور اگر کسی کا نام پیش کروں تو ایسا بھی کر سکتا ہوں۔ کیونکہ ابوبکرؓ کی مثال موجود ہے جو مجھ سے بہتر تھے۔ لہٰذا اگر کسی کو موزوں دیکھوں تو اس منصب کے لیے اسے تجویز کر سکتا ہوں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ سوچنے کے بعد حضرت عمرؓ نے ان دونوں صورتوں کے بین بین یعنی درمیانی راستہ اختیار کیا اور انھوں نے امر شوریٰ چھ آدمیوں میں منحصر کر دیا کہ وہ اپنے میں سے کسی کو خلیفہ منتخب کر لیں۔ حضرت عثمانؓ کو اختیار کیا گیا، اور لوگوں نے ان کی بیعت کر لی۔

لیکن اس موقع پر بھی یہ بات فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ یہ مجلس شوریٰ جو حضرت عمرؓ نے بنائی تھی، ایک طرح کا تجویزی شوریٰ تھا۔ معین اور طے شدہ اور فیصل شوریٰ نہ تھا۔ اگر مسلمان حضرت عثمان کی بیعت نہ کرتے تو حضرت عمرؓ کی مجلس شوریٰ کے فیصلے کے باوجود حضرت عثمانؓ خلیفہ نہیں ہو سکتے تھے۔ کیونکہ صرف تجویز کسی کی امامت کا فیصلہ نہیں کر سکتی، بلکہ امامت تو اس وقت ثابت اور قائم ہوتی ہے جب پوری آزادیٔ رائے سے کسی شخص کی بیعت کی گئی ہو۔ آزادیٔ رائے ہی درحقیقت ولایت عہد یا امام و خلیفہ کا تحقق کر سکتی ہے۔

ابن حزم کا قول ہے کہ اختیار خلیفہ انہی تینوں میں سے کسی ایک طریقے پر منحصر ہے۔ ان کے نزدیک کوئی چوتھا طریقہ انتخاب خلیفہ کا وضع نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ اگر ایسا کیا گیا تو یہ اجماع صحابہ کے خلاف خروج ہوگا۔ کیونکہ انھوں نے انھی طریقوں کو پسند کر کے گویا اجماع کر لیا تھا۔

ہماری رائے یہ ہے کہ مذکورہ تینوں طریقے اختیار خلیفہ سے متعلق بے شک اور بلاشبہ اپنے زمانے میں بالکل درست اور موزوں تھے لیکن اختیار خلیفہ کو انھی میں منحصر کر دینا ٹھیک نہیں ہے۔ ہر زمانے میں حالات اور مصالح کے لحاظ سے شوریٰ کی روح کو پیش نظر رکھتے ہوئے ایسا طریقہ اختیار خلیفہ سے متعلق اختیار کیا جا سکتا ہے جو امت کی رائے اور جذبات کا صحیح طور پر ترجمان ہو۔

بہر حال یہ تھا وہ نظام اختیار خلیفہ کے بارے میں جس کی پیروی صحابۂ کرام نے کی، اور

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

شوریٰ کو اس پر مبنی قرار دیا۔

لیکن اس جگہ دو بے حد اہم سوال پیدا ہوتے ہیں:

۱۔ عصر صحابہ میں اہل شوریٰ کون حضرات تھے؟

۲۔ اگر کوئی امام (خلیفہ) بغیر شوریٰ کے خلیفہ بن جائے تو کیا اس کی طاعت واجب ہوگی؟

پہلے سوال کا جواب دیتے وقت ہمیں فعل صحابہ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ چنانچہ ہم کہنا چاہتے ہیں:

ابوبکرؓ کو جن لوگوں نے خلیفہ بنایا وہ اہل مدینہ تھے۔ یعنی مہاجرین و انصار۔ انھی لوگوں نے عمرؓ کی، پھر عثمانؓ کی بیعت کی۔

گویا مدینہ ہی کے لوگ اختیار امام کا تنہا حق رکھتے تھے۔ اور یہ قدرتی چیز تھی۔ کیونکہ مدینہ ہی وہ مقام تھا جہاں اسلام پھلا پھولا اور برگ و بار لایا۔ یہیں کے لوگ تھے جو دعوتِ اسلامیہ کے لیے رضاکارانہ اور فداکارانہ سرگرم عمل تھے۔ انھوں نے ان گوشوں تک اور جہات عربیہ میں ان مقامات تک اسلام کو پہنچا دیا جہاں ابھی اس کے قدم نہیں جم پائے تھے۔

اور ہمارے اس دعوے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ وفات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد عرب کا بڑا حصہ مرتد ہو گیا۔ لیکن دو شہر ایسے تھے جن تک ارتداد کی ہوا نہیں پہنچی اور یہ دو شہر تھے مدینۂ منورہ اور مکۂ مکرمہ۔ اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں تھا کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال کے بعد جب خلیفہ کے انتخاب کا مسئلہ درپیش ہوا، تو وہ ان لوگوں کو بھی شریک مشورہ کر لیتے جو اسلام کو پارہ پارہ کر دینے کی تدبیریں سوچ رہے تھے۔ اور حلقۂ اسلام سے باہر نکل جانے کی تیاریاں کر رہے تھے۔

اس کے بعد عمرؓ اور عثمانؓ کا دور آتا ہے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ وہ دَور ہے جب عرب دوسری اقلیموں میں جہاد کرتے ہوئے اور جنگ کرتے ہوئے پہنچ چکے تھے۔ جہاں یہ عرب مجاہد گئے تھے یہ دور دست علاقے تھے۔ ان اقالیم کے باشندوں کو فی الحال حق بیعت وشوریٰ دیا جانا ممکن نہیں تھا۔

اس کے بعد حضرت علیؓ کا دَور آیا۔

یہ وہ زمانہ تھا کہ عرب مختلف اقالیم میں باقاعدہ توطن اختیار کر چکے تھے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں شام میں عربوں کی بہت بڑی تعداد جا بسی تھی۔ اسی طرح بصرہ، کوفہ اور مصر میں بھی اچھی خاصی تعداد میں عرب مقیم تھے۔ بایں ہمہ علیؓ کو بھی جن لوگوں نے خلیفہ بنایا وہ مدینے کے باشندے تھے، اور حضرت علیؓ نے بادل نخواستہ یہ پیش کش قبول کر لی، تاکہ مسلمانوں میں انتشار اور تفرقہ نہ پیدا ہو، اور امر مسلمین کے استحکام وتحفظ کے فرائض انجام دے سکیں۔

حضرت علیؓ یہ حالات دیکھ کر تنہا اہل مدینہ کے اختیار خلیفہ پر رضامند ہو گئے۔ شاید انھوں نے یہ بھی محسوس کیا کہ جو عرب اس وقت مختلف دیار وامصار میں اقامت اختیار کیے ہوئے ہیں ان کی بڑی تعداد وہ ہے جو باقیات اہل ارتداد میں سے ہے۔

ایک اور اہم نکتہ،

اسلام کی جڑ ان دیار وامصار میں ابھی مضبوط نہیں ہوئی تھی، لہٰذا ہر فرد امت کو اختیار خلیفہ میں حصہ دار نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ علاوہ ازیں عہد جاہلی کے تعصبات نے پھر سے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔ اس موقع پر اگر عام حق رائے دہی دے دیا جاتا تو عرب اور موالی[1] دونوں برابر کے شریک ہوتے اور مدائن اسلامیہ میں غیر معمولی اکثریت عربوں کے مقابلے میں موالیوں ہی کی تھی۔ لہٰذا ضروری تھا کہ انتظار کیا جاتا اور عام حق رائے دہی کو استقرار امور تک محدود کر دیا جاتا۔

---

[1] آزاد کردہ غیر عرب غلام جو آزاد ہونے کے بعد اپنے کاروبار میں لگ کر نہیں مقیم ہو گئے تھے (رئیس احمد جعفری)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی اثنا میں ایک اور صورت حال پیدا ہو گئی۔

امیر معاویہ سامنے آگئے، اور انھوں نے امام ہدیٰ (علیؓ) سے جنگ شروع کر کے ایک نیا دور شروع کر دیا۔ انھوں نے حضرت علیؓ کی بیعت نہیں کی۔ لوگوں کو بیعت شکنی پر اکسایا۔ جن لوگوں نے بیعت کر لی تھی اور اس پر قائم تھے ان کے خلاف مورچہ قائم کر دیا، اور اس طرح حالات کو حد سے زیادہ دگرگوں اور خراب و خستہ کر دیا۔

شاید یہی وہ امور تھے کہ حضرت علیؓ اس نتیجے پر پہنچے کہ اختیار خلافت سے متعلق شوریٰ کا معاملہ صرف اہل مدینہ کے ہاتھ میں رہنا چاہیے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں حضرت علیؓ نے جو راستہ اختیار کیا، اس کے علاوہ کوئی دوسرا چارہ کار بھی نہ تھا۔

کیا یہ کوئی معقول بات ہوتی کہ جب مدینہ باہر کے فتنہ طرازوں کے محاصرے میں تھا، اس کا اہتمام کیا جاتا کہ مصر، شام، عراق اور فارس کے عربوں میں سے فرداً فرداً اس معاملے میں رائے لی جائے؟

کیا یہ کوئی مستحسن اقدام ہوتا کہ عام حق رائے دہی دے کر عربوں کو موالیوں کی کثرت تعداد کے باعث ان کے حق سے محروم کر دیا جاتا؟

البتہ بیعت کی دوسری بات تھی۔ وہ ہر عرب سے لی جا سکتی تھی خواہ وہ کہیں ہو۔ عام بیعت کے باوجود مدنی نظام شوریٰ قائم رہ سکتا تھا۔

چنانچہ جملہ بلاد کے لوگوں نے حضرت علیؓ کی بیعت کر لی —— سوا شام کے۔

امیر معاویہ کے لیے مناسب اور مستحسن یہی تھا کہ مصلحت اسلام کے سامنے سر جھکا دیتے اور عربوں کی غیر معمولی اکثریت کا فیصلہ تسلیم کر لیتے۔ اور حضرت علیؓ کے مقام کو پہچانتے۔ کیونکہ بلاشبہ وہ بغیر کسی اختلاف و منازعت کے اپنے وقت کے امام برحق تھے۔

لیکن افسوس کہ جذبۂ ملک گیری، عصبیتِ عربیہ اور فکرِ جاہلیت مُلّت کے مصالح عمومی پر غالب ہو گئی —— لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اب رہا دوسرا سوال یعنی اگر خلیفہ بغیر شوریٰ کے مسند خلافت پر قابض ہو جائے تو کیا اس کی طاعت واجب ہے؟

اس سلسلے میں ہم یہ کہنا چاہتے ہیں کہ:

جمہور فقہاء کا قول اس باب میں یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس حالت میں کہ مسلمانوں کا کوئی امام جائز موجود نہ ہو، زبردستی مسند خلافت پر قابض ہو جائے لیکن شرائط امامت سے بہرہ ور ہو، عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کرتا ہو، لوگ اس کا یہ رنگ دیکھ کر خاموش ہو رہے ہوں اور اس کی بیعت کر لی ہو تو وہ امام ہے۔

"المدارک" میں وارد ہوا ہے:

"ابن نافع کا قول ہے کہ امام مالک کے نزدیک اہل حرمین اگر کسی کی خلافت تسلیم کر کے بیعت کر لیں تو اہل اسلام پر اس کی بیعت واجب ہے۔"

اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل اختیار سے متعلق امام مالک کی رائے کیا تھی؟

مذکورہ قول کے مطابق امام مالک حضرت عمر بن عبدالعزیز کی خلافت کو ایسی خلافت سمجھتے تھے جو غلبہ سے حاصل کی گئی ہو، کیونکہ ان کی خلافت شوریٰ پر مبنی نہیں تھی، لیکن مسند خلافت پر تشریف فرما ہونے کے بعد انھوں نے عدل قائم کیا۔ مظالم کی بیخ کنی کی، حق و صداقت کو استوار کیا۔ لہذا عدم شوریٰ کے باوجود وہ امام برحق تھے۔

اس سے ثابت ہوا کہ امام مالک کے نزدیک بیعت پر اختیار سابق امام شرط لازم نہیں ہے، بلکہ بیعت بجائے خود کوئی شرط نہیں ہے۔ صرف رضا اور اقامت حق کافی ہے۔

امام شافعی رضی اللہ عنہ بھی اس رائے کے قائل ہیں یعنی رضا ر لاحق پر اکتفا کرتے ہیں۔

چنانچہ امام شافعی کے شاگرد حرملہ کی روایت ہے کہ امام شافعی نے فرمایا:

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

"کوئی قریشی اگر بزور شمشیر خلافت حاصل کرلے، اور لوگ اس کی حکومت تسلیم کرلیں تو وہ خلیفہ برحق ہے۔"

گویا امام شافعی کے نزدیک اعتبار قرشیت اور اقامت عدل اور عوام کی رضامندی کا ہے، عام اس سے کہ یہ رضا اقامت سے سابق ہو یا لاحق۔

امام احمد بن حنبل بھی اسی رائے کے ہیں۔ انھوں نے اپنے رسائل میں سے ایک میں فرمایا ہے:

"جو منصب خلافت پر قابض ہو جائے۔ لوگ اسے تسلیم کرلیں، اور اس سے رضامند ہو جائیں تو بے شک وہ خلیفہ ہے!" اور جو شخص بزور شمشیر لوگوں کا خلیفہ بن جائے وہ بھی خلیفہ جائز ہے۔

اسی طرح امام حنبل مزید فرماتے ہیں:

"جس نے ائمۂ مسلمین میں سے کسی امام مسلمین پر خروج کیا۔ لوگوں نے اسے تسلیم کرلیا۔ خواہ بہ رضا و رغبت یا بہ جبر و اکراہ تو یہ ایسا شخص ہوگا جو خارج جماعت ہے کیونکہ آثار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے خلاف جاتے ہیں۔ لہذا اگر یہ شخص اسی حالت میں مرگیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔"[۲]

غرض یہ ہے اس باب خاص میں جمہور فقہاء اسلام کا مسلک، اس سے کیا ثابت ہوتا ہے؟

---

[۱] یعنی کبھی کی بیعت

[۲] المناقب لابن جوزی، ص ۱۸۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ کہ خلافت متغلب[1] ان حضرات کے نزدیک خلافت نبویہ ہے، بشرطیکہ یہ متغلب شرائط امامت پورے کرتا ہو، اور عدل و انصاف کے اصول پر عامل ہو۔

مناسب ہے کہ شرائط امامت میں دو مزید شرطوں کا اس جگہ بیان کر دیا جائے۔ اور یقیناً ان فقہاء کرام نے امامت متغلب کو تسلیم کر لینے کا مسلک اختیار کرنے کے باوجود ضرور ملاحظہ فرمایا ہوگا۔

وہ دو شرطیں یہ ہیں:

۱۔ خلافت متغلب اس وقت قابل قبول ہوگی جب کوئی دوسرا امام موجود نہ ہو، کیونکہ اگر اس کے تغلب کے وقت امام برحق موجود ہے جو عدل و انصاف کے راستے پر گامزن ہے۔ لوگ اس سے خوشنود ہیں تو یہ شخص باغی ہوگا۔ اس سے جنگ واجب ہے۔ بلکہ اس کا قتل واجب ہے۔ کیونکہ رسالت مآبؐ کا ارشاد ہے:

"کوئی شخص اس حالت میں تمہارا حاکم بن جائے کہ پہلے سے کوئی امام تمہارا موجود ہو تو اسے قتل کر دو!"

۲۔ حالات ایسے ہوں کہ اختیار و انتخاب کا موقع ہی نہ ہو، اور خلیفہ کا وجود جلد از جلد ضروری ہو۔ مثلاً امام جنگ کرتا ہوا قتل ہو جائے اور اختیار و انتخاب کا موقع نہ ہو۔

بصورت دیگر شوریٰ سے انحراف جائز نہیں! کیونکہ اگر اسے جائز قرار دے دیا جائے تو شوریٰ کا ستون منہدم ہو جائے گا۔ اور متغلبین کو ایک نادر موقع ہاتھ آجائے گا۔ اور مسلمان مبتلائے مصیبت ہو جائیں گے جیسا کہ ماضی میں ہوتا رہا ہے۔

---

[1] یعنی غاصب

© rasailojaraid.com